ہدایت کا ماخذ: دین یا انسانی جبلت؟

طارق محمود ہاشمی

عمار خان ناصر صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارے اعتراض پر تبصرہ عنایت فرمایا۔ جواب میں انہوں نے اپنے موقف پر اصرار کیا ہے۔ ان کے تبصرے سے معلوم ہوا کہ غالباً ہماری بات واضح نہیں ہو سکی۔ ہماری تنقید فقط ایک نکتے تک محدود تھی: عمار صاحب نے لکھا تھا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، تو اس کی توجہ "فطرت کی وجہ سے اس طرف گئی کہ اب میت کو کسی طرح ٹھکانے لگانا چاہیے"۔ ہم نے واضح کیا کہ کوّے سے ملنے والی "ہدایت" فطرتِ انسانی میں موجود نہیں تھی۔ عمار صاحب لکھتے ہیں کہ دین اصلاً فطرت کی ہدایت پر کھڑا ہے، نبوت اور وحی کا انتظام بس اُن مسائل کے لیے ہوتا ہے جنہیں انسانی فطرت اور عقل حل نہ کر سکیں۔ اُن کے اس قاعدے کو دو پہلوؤں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اول: یہ اصولِ موضوعہ ظاہر ہے کہ دین کی نصوص میں کہیں بیان نہیں ہوا، بعض قیاسات اور بعض درآمد شدہ نظریات سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے نتیجے میں نبوت و رسالت دین میں جوہری (essential) نہیں بلکہ عارضی (accidental) اہمیت کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ ہمارے علم کی حد تک یہ عقیدہ فقط مبتدعہ قدیمہ کے ہاں ملتا ہے، یا پھر جدید اسلام کے معماروں کے ہاں۔ مبتدعہ جدیدہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ہاں اس کے اشارے ملتے ہیں۔ یہ عقائد میں تصرف کی طرف جانے والا راستہ ہے اور نہایت پُر فتن ہے۔

دوم: زیر نظر آیہ قرآن مجید سے واضح ہے کہ یہ مسئلہ — کہ وہ میت کے ساتھ کیا معاملہ کرے — قابیل اپنی عقل اور فطرت سے حل نہ کر سکا۔ غامدی صاحب اور عمار صاحب کے اصولوں کے مطابق یہ وہ صورت تھی جس کے لیے اللہ نے سلسلۂ نبوت کو جاری فرمایا ہے۔ یعنی ان کے بقول جہاں عقل و فطرت ناکافی ہوں، وہاں — اور فقط وہاں — وحی مداخلت کرتی ہے۔ اس صورتِ حال میں، ان کے اصول کی رُو سے ضروری ہو گیا تھا کہ قابیل کو وحی کی رہنمائی فراہم کی جاتی۔ لیکن انہیں خود تسلیم ہے کہ قابیل کے پاس نہ وحی کی ہدایت موجود تھی، نہ ہی اس مسئلے کو وہ اپنی فطرت و عقل سے حل کر سکا۔ یعنی الوہی ہدایت کا جو قانون انہوں نے بیان کیا ہے، وہ آگے چل کر تو کیا، بنی نوع آدم کی پہلی ہی نسل میں غلط ثابت ہو گیا۔

جہاں عمار خان ناصر صاحب کو فقط دو عدد احتمالات نظر آ رہے ہیں، وہاں اور بھی ممکن ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے کہ کوّا محض تذکیر کے لیے بھیجا گیا ہو۔ جس کے نتیجے میں قابیل اپنے والدین کے سکھائے ہوئے طریقۂ تدفین کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ طریقہ جو فطرت میں تو نہ تھا، پر اس کے والد علیہ السلام کو وحی سے معلوم ہوا تھا اور انہوں نے اور ہابیل و قابیل کی والدہ نے اپنے بچوں کو سکھایا تھا۔ یہی معاملہ شناعتِ قتل کا بھی ہے۔ قتل کی قباحت تو فرشتوں کو تخلیق آدم سے بھی پہلے معلوم تھی (من يفسد فيها و يسفك الدماء)، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو معلوم نہ ہو، اور انہوں نے اپنے بچوں کو اس کی خبر نہ دی ہو؟ لہذا قتل کی شناعت بھی فطرت سے نہیں، بلکہ شرع

سے معلوم ہوئی۔ اگر قتل کی شناعت انسان کی "فطرت" میں ہوتی، تو غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کے اصول کی رُو سے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اسے شرع میں بیان کیا جاتا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ تمام شرائع میں بیان ہوئی ہے۔ اور یہی معاملہ مردے کی تدفین کا بھی ہے۔ رہی فطرت، تو آج بھی قریباً نصف انسانی آبادی مردوں کو دفنانے کا التزام نہیں کرتی۔ پھر یہ انسانی فطرت کیسے ہوئی؟

اس کے جواب میں عمار ناصر صاحب نے جو وضاحت فرمائی ہے وہ تمام قیاس و ظن و تخمین ہے۔ یہ اہم دینی اصول جس پر، ان کے خیال میں، تمام دین کا فہم موقوف ہے، قطعی نصوص میں موجود ہونا چاہیے تھا، کہ یہ فروعی مسئلہ نہیں، اصولی ہے، بلکہ اصل الاصول ہے، جس کا قطعی بیان نصوص میں لازم تھا۔ لیکن، اگر یہ معاملۂ مبہم صدیوں پوشیدہ رہنے کے بعد، اب سرسید، فراہی، غامدی صاحب اور عمار صاحب کے ظن و قیاس پر ہی منحصر ٹھہرا ہے، تو ہم بھی کچھ سوالات اٹھانے کی اجازت چاہتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ علیہا السلام نے اپنے بچوں کو میت کے ساتھ کیا معاملہ کرنے کی تعلیم دی تھی؟ زندگی کے بہت سے مسائل تو عوارض کے طور پر لاحق ہوتے ہیں، لیکن موت تو یقینی ہے، اور خاندان کے ہر فرد کو اس سے معاملہ پیش آنا ہے۔ یہ بات قابیل کے والدین علیہما السلام کو بھی یقیناً معلوم ہو گی۔ اس اہم اور ناگزیر معاملے میں نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ اور حضرت آدم علیہ السلام سے کیسے چوک ہو گئی؟ انہوں نے یہ بات روزِ اول نسلِ انسانی کو کیوں نہ بتائی کہ انسانی میت کی تدفین کرنا؟ کیا کوئی نبی ایسا ہو سکتا ہے جو موت کے بارے میں احکام بھی اپنی اولاد کو نہ بتائے؟ اگر یہ بات مان لی جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بچے دین کی ایسی بنیادی تعلیم سے بے خبر تھے، جس میں فطرت بھی ان کی مدد کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی، تو وہ یکسر اندھیرے میں تھے۔ یہ جو بار بار کہا جا رہا ہے کہ روزِ ازل بنی نوع انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا اندھیرے میں نہیں، بلکہ ہدایت کی کھلی روشنی میں کی تھی، غامدی صاحب اور عمار صاحب کے اصولوں کی روشنی میں اس اندھیرے کی کیا توجیہ ہو گی؟ بہ ظاہر اس سے فطرت کے حق میں ان حضرات کا پورا مقدمہ ہی بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ کی وفات پہلے ہی ہو چکی تھی۔ (اگر وہ حیات ہوتے تو قابیل کو یہ سوال اپنے والدین سے پوچھنا چاہیے تھا، کسی جانور کا محتاج کیوں ہونا پڑتا؟) یہ کیسے ممکن ہے کہ قابیل کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے والد اور والدہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ کی میت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا—یعنی انہیں دفنایا گیا، یا پانی میں بہایا گیا، جلایا گیا، یا یونہی آسمان تلے کھلا چھوڑ دیا گیا؟ بھلا یہ ممکن ہے؟ ہاں البتہ انسانوں کو غفلت و نسیان لاحق ہو سکتا ہے۔ جس کے لیے اللہ نے ایک اور انتظام کیا—یعنی تذکیر کا۔ لیکن بہر صورت فطرت پر منحصر نہیں چھوڑا۔

ہم آئندہ صفحات میں واضح کریں گے کہ قرآن مجید میں عہد الست کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے جسے "انسانی فطرت" کا محتویٰ قرار دیا جا سکے۔ اس کے علاوہ دیگر دلائل سب خارجی اثرات کا نتیجہ ہیں، اور فی الاصل نہ دینی ہیں نہ علمی۔

دین پر کلام کرنے کا سب سے خطرناک طریقہ یہ ہے کہ کسی نظریے اور دعوے کو پہلے سے فرض کر کے دینی مآخذ کی جانب رجوع کیا جائے، اور پھر بہر حال مطلوبہ مقدمے کے حق میں "بینات" ڈھونڈ نکالی جائیں، اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کی تاویلات کو روا رکھا جائے۔ مسلمانوں پر استعماری غلبے کے بعد کئی موضوعات پر یہ طریقہ اختیار کیا گیا، اور جوں جوں کام آگے بڑھا، سطحیت بھی بڑھتی گئی۔ "فطری ہدایت" کے اس مبالغہ آمیز تصور کو ہر حال میں قرآن مجید سے برآمد کرنے کے کوشش بالآخر مضحکہ خیز ہوتی جارہی ہے۔ امید ہے کہ عمار خان ناصر صاحب "فکر فراہی" کے دفاع سے آگے بڑھیں گے اور ایک فرقے کے اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر مسئلے کو خالص علمی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش فرمائیں گے۔ وماعلینا الا البلاغ۔

مورخہ: ۲۹/جون، سنہ ۲۰۱۶ء

***